ڈاکٹر رُخسانہ بلوچ
استاد شعبہ اُردو
گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

اقبال کی شاعری میں تصورِ حیات

Allama Iqbal was prominent poet and philosopher of 20th century. He depicted manifold aspects of human life in his writings. He did many experiments in his poetry. His experimentation makes him a modern poet in the true sense of the term. This article focuses on analyzing the concept of life through the lens of Iqbal's poetry. He always focused on optimistic perspectives and discouraged the pessimism among the youth.

علامہ اقبال نے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں صوفی نور محمد کے گھر آنکھ کھولی۔ دنیا نہیں جانتی تھی کہ نومولود بچہ آنے والے وقتوں میں آفاقی حیثیت حاصل کر جائے گا۔ دنیا اس کے کلام کی معترف ٹھہرے گی۔ علامہ اقبال نے اپنی عملی زندگی کے ساتھ ساتھ شاعری کی زندگی میں قدم رکھا تو وقت کے جید علما بھی اس کے اندازِ شاعری کے معترف ہوئے۔ اقبال کی شاعری کے ابتدائی نمونے بھی الگ حیثیت کے حامل ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی محبت اقبال کی روح میں سمائی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اکثر رسول اکرم ﷺ کی محبت اور فراق میں آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری سے یہ بات واضح دیکھی جا سکتی ہے :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے

یہ ابتدائی کلام شاعری کی ایک جھلک ہے۔ علامہ اقبال نے شاعری کی ابتدا روایتی غزل سے کی جس کا دور دور ہ تھا۔ ابتدا میں انھوں نے میرؔ و داغؔ کی پیروی کی۔ چند دن انھوں نے اپنی شاعری کی اصلاح داغؔ سے بھی حاصل کی۔ اندازِ کلام کو دیکھتے ہوئے داغ کو کہنا پڑا کہ اقبال کو اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔ آہستہ آہستہ انھوں نے غزل کی پرانی روایات کو ترک کر کے نئی متعارف ہونے والی صنف سخن نظم کی جانب توجہ دی۔ اقبال نے نظم کے امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنے فن اور فکر کی گہرائی سے اردو نظم کو ثریا کی بلندی عطا کر دی۔ ان کی طویل نظموں میں ''مسجد قرطبہ'' ، ''ساقی نامہ''، ''خضرِ راہ'' ، ''ابلیس کی

مجلسِ شوریٰ"،"شمع اور شاعر" ،"ذوق و شوق" ، "شکوہ "،"جوابِ شکوہ"اور مختصر نظموں میں "جبریل و ابلیس"،"لینن خدا کے حضور میں"اور"شعاعِ امید"خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال نے ابتدا میں قومی نظمیں اور مناظرِ فطرت کی جانت توجہ مرکوز کی۔جب فن و فکر کی پختگی محسوس ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں کو زبوں حالی سے نجات دلانے کے لیے ان اسباب کا پتہ چلانے کی طرف گامزن ہو گئے جن کی وجہ سے مسلمان زبوں حالی کا شکار تھے۔ان وجوہات کو انھوں نے مذہبی اور فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا۔کلامِ اقبال میں انسانیت کی اتھہ گہرائیوں میں پوشیدہ وہ راز بھی مل جاتے ہیں جن کا ظاہری آنکھ سے دیکھنا درکنار ہے۔یہ اقبال کا نورِ بصیرت ہی تھا جس نے احترامِ آدمیت کے در وا کیے۔ اقبال کی شاعری ہر مکتبہ فکر کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ان کی شاعری تصورات اور خیالات سے لبریز ہے۔ اقبال انسان کو عرفان ذات ، اپنی ذات ہی سے حاصل کرنے کا ملکہ خیال کرتے ہیں۔اقبال اس کھیتی کی مٹی کی زرخیزی کے معترف ہیں۔اس کو صرف چند بوندوں کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس کے کھیت لہلہانے لگتے ہیں۔اقبال درگاہوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر خودی کے راز تلاش کرنے کی مخالفت کرتے ہیں۔وہ تو عملی زندگی میں اپنے پوشیدہ راز تلاش کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔اقبال جہدِ مسلسل سے تقدیر بدلنے کے حامی ہیں۔ان کے طرزِ کلام سے شب و روز کی محنت عملِ پیہم سے ناامیدی اور مایوسی کو شکست و ریخت سے ہمکنار کرنے کی سعی ملتی ہے۔اقبال فلسفہ اسلامی "حیات بعد الموت" کے قائل ہیں۔انھوں نے ظاہری انسانی زندگی کی بنیاد پر موت کے بعد کی زندگی کو اس کائنات کی عمارت کو استوار کرنے پر زور دیتے ہیں۔اقبال کے ہاں انسانی حیات کا موضوع الگ خاصیت رکھتا ہے۔تصورِ حیات کو انھوں نے نیا جامہ پہنا دیا۔اقبال کی شاعری میں تصورات کی قوس قزح نظر آتی ہے۔آئے روز نئے نئے خیالات کے در روشن ہوتے رہتے ہیں۔ فکرِ اقبال ہمیشہ ثریا کی سی بلندی پر رہے گی۔ہر طلوع ہوتا سورج ایک نئی نوید لے کر آتا ہے۔اسی طرح کلامِ اقبال کا ہر عضو روشن اور نئی آہنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔

"حیات" سے مراد ظاہری زندگی لیے جاتے ہیں۔اس لفظ کو اقبال نے معنی کا نیا جامہ پہنا دیا ہے۔اس لفظ میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔کہنے کو تو یہ صرف لفظ "حیات" ہے مگر یہ دریا کی ان لہروں کی مانند ہے جو ساحلوں سے ہر وقت ٹکراتی رہتی ہیں اور ہر وقت اپنی ناکام کوشش سے دوبارہ اسی دریا کا حصہ بن جاتی ہیں۔اگر کوئی منہ زور لہر دریا سے باہر نکل کر سونامی کی شکل میں تباہی و بربادی اور کھیتوں کی آبیاری کر بھی لے تو دوبارہ اسے اپنی اصل کی جانب لوٹنا ہی پڑتا ہے۔جب وہ اپنی اصل سے ملتی ہیں تو ان

کا ایسی کائنات سے واسطہ جڑ جاتا ہے جہاں ایسی ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں لہریں اپنی زندگی کی سانسیں پوری کرتی دکھائی دیتی ہیں۔رب ذوالجلال کی بنائی ہوئی کائنات کی ہر وہ چیز جو اس میں اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے۔اپنی ظاہری حیات پوری کرنے کے بعد اپنی اصل سے مل جاتی ہے۔جہاں اس کی "حیات" نیا عملی جامہ پہن لیتی ہے جو اس کی اصل حیات ہے۔یہ عمل جاری و ساری ہے۔چاہے وہ ظاہری آنکھ سے نظر آئے یا نہ آئے۔

"فرہنگ آصفیہ" کے مؤلف نے "حیات" کے درج ذیل معنی درج کیے ہیں:

"زندگی۔جان۔پران۔روح۔زیست۔عمر۔اوستھا۔"(۱)

مؤلف "جامع اللغات" نے اس کے درج ذیل معنی درج کیے ہیں:

"زندگی۔عمر۔زیست۔جان۔روح۔"(۲)

مولوی فیروزالدین کے مطابق:

"زندگی، زیست، عمر، جان، روح۔"(۳)

کسی بھی چیز کی ظاہری زندگی کو حیات کہا جاتا ہے۔ظاہری زندگی چند دنوں کی مہمان ہوتی ہے۔ کائنات کا تمام نظام اسی حیات ہی کی وجہ سے قائم و دائم ہے۔اقبال کی شاعری میں لفظ "حیات" بار بار ملتا ہے۔ہر دفعہ "حیات" کو اقبال نے نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے اس طرح باندھا ہے کہ اس کی ماہیت ہی تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔یوں تو علامہ اقبال کے فن و فکر پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔اقبال کا فکروفن ہمیشہ دوسرے شعرا سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔آئے روز معانی اور مفاہیم بدلتے رہیں گے۔علامہ اقبال کی شاعری کا بنیادی موضوع "انسان" کے لفظ کے گرد ہی گردش کرتا نظر آتا ہے۔انسان جو کہ وجہِ تخلیق کائنات بھی ہے۔اسی کے دم سے اس کائنات کی خوب صورتی زندہ و تابندہ ہے۔علامہ اقبال نے انسان کی اس عارضی زندگی کی جانب بھرپور توجہ دلانے کی کوشش کی اور دنیا و جہان کا کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس کی جڑت انسانی زندگی سے نہ ہو۔انھوں نے اپنے جاندار اسلوب اور طرزِ نگارش سے انسان کے باطن کو جھنجھوڑنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔علامہ اقبال کی شاعری میں ہر وہ تصور مل جاتا ہے جن پر عمل کرنے سے یہ دھرتی امن کا گہوارہ بن جائے گی۔اقبال "حیات بعد الموت" کی بقا چاہتے ہیں۔کبھی فکر و فن کی صورت گری ، کبھی خودی کی جانب توجہ دلانے کی سعی تو کبھی فرمانِ خداوندی

سے "رموزِ حیات" تلاش کرتے ہیں۔ کبھی مردِ مومن کا نقشہ کھینچتے ہیں تو کبھی اسی حیات انسانی کو شاہین کے پر لگا دیتے ہیں، تو کبھی بالِ جبریل اور تصورِ کلیم کا سہارا لیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے "بانگِ درا" کی نظم "کلی" میں "حیات" انسانی کو خوب صورت انداز اور دل کش شاعری میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ تاریک رات میں بادِ صبا جب اوس کے قطرے نئے کھلنے والے پودوں پر ڈالتی ہے تو صبحِ نور کی کرنیں ہر چیز کو منور کر دیتی ہیں۔ ہر کوئی جاندار اپنی نئی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے سورج اپنی تمازت بڑھاتا ہے تو غنچے چٹک کر پھول بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر شاعر کو متاثر کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنی تھکن دور کر کے اور تازہ دم ہو کر زندگی کے نئے دن کا آغاز کرتا ہے۔ یہاں پر اقبال سورج سے اپنی زندگی کو جوڑتے ہیں اور اسی کے دم سے اپنی حیات میں سوز محسوس کرتے ہیں۔ سورج کی کرنوں سے اپنی "حیات" کے ہر پوشیدہ گوشے کو باطن کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ان نئی روشنی اور کرنوں سے اپنی "حیات" کے مخفی راز پانے کی جستجو کرتے ہیں:

ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوز حیات
ہو عیاں جوہر اندیشہ میں پھر سوز حیات(۴)

"حیات" کو معنی کے لحاظ سے عمر، زیست، زندگی، جان، روح تصور کیا جاتا ہے۔ اسی "حیات" سے کائنات کے تمام رنگ نظر آتے ہیں۔ حیات اگر بے معنی ہو جائے تو یہ کائنات بے مائیہ، افسردگی، غم و الم، مایوسی اور نامرادی کا محور بن جاتی ہے۔ اگر انسان "حیات" کی صحیح معنوں میں تکمیل کر لے تو اس کا کام آفاقی نوعیت کا ہو جاتا ہے اور وہ شخص مر کر بھی امر ہو جاتا ہے۔ رہتی دنیا تک اس کا نام و نشان باقی رہتا ہے۔ دنیا اس کی معترف رہتی ہے جو شخص اپنی "حیات" کے مخفی رازوں کو پا لیتا ہے، اصل معنوں میں یہی 'حیات بعد الموت' ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری انسان کے باطن کو ہلا کے رکھ دیتی ہے۔ اقبال ہر لحظہ نئی آن اور نئی شان کے قائل ہیں۔ وہ ہمیشہ ولولے اور جوش سے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے انسان کو جگاتے نظر آتے ہیں۔ جب انسان حقیقی معنوں میں انسان مومن کے درجے پر فائز ہوتا ہے تو اقبال کے مطابق یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ وہ موت سے بھی مر نہیں سکتا۔ موت کے بعد دنیا اس انسان کی معترف ہو تو صحیح معنوں میں یہ "حیات" ہے۔ ہر اک کی خواہش تو ہوتی ہے کہ اوجِ ثریا پر مقیم ہو جائیں مگر اس کے لیے انسان کو شب و روز کی محنت درکار ہوتی ہے۔ بغیر محنت کے انسان کو رفعت حاصل ہونا معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ حقیق تب ہی نگین ہوتا ہے جب اس کو سو بار کاٹا جاتا ہے۔ "بانگِ درا" کی نظم "نوائے غم" میں حیات کو

دل فریب نظاروں سے معطر کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جس میں بظاہر زندگی خاموش رباب کی مانند مگر جب اس کے ارہ ہلائے جاتے ہیں تو اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اس کی خاموش زندگی میں پوشیدہ نغمے ظاہر ہونے لگتے ہیں جس کا ہر سر اور تال زندگی میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔رباب کی ظاہری زندگی جمود پر مشتمل ہے اور اقبال اس زندگی کو موت قرار دیتے ہیں:

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے میرا تارِ حیات
جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتارِ حیات[۵]

"حیات" کی پہچان کر لینے والے کو اقبال مردِ مومن ، مردِ خدا، خودی کا پیکر قرار دیتے ہیں۔ان باتوں کی تکمیل کو اقبال عشق کے بغیر ادھورا تصور کرتے ہیں۔عشق ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کے کام اور فن کو معراج عطا کرتا ہے۔معراج کے لفظ کا حقیقی معنوں میں جائزہ لیا جائے تو اس کا مطلب ہے 'ملنا'۔ دراصل یہ ملاقات اس کے مالکِ حقیقی سے ملنے کا اشارہ ہے۔اقبال نے اپنی معروف نظم ""مسجدِ قرطبہ" میں اسی فن کی طرف اشارہ کیا ہے۔""مسجدِ قرطبہ" کا شمار اقبال کی طویل نظموں میں ہوتا ہے۔اس میں اقبال مردِ کامل ، مردِ مومن ، مردِ خدا کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر عشق کا جذبہ انسان میں موجود ہو تو وہ دنیا کی کسی بھی جگہ کو حرم کا رتبہ عطا کر دیتا ہے اور یہ کام ہی دراصل اس کی 'حیات' کو لازوال بنا دیتا ہے:

مردِ خُدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام[۶]

اقبال کی شاعری میں شروع ہی سے خلوص نظر آتا ہے جو کچھ محسوس کرتا ہے وہی کہتا ہے اور جب تک طبیعت پر کوئی تاثر طاری نہیں ہوتا وہ نہ دوسروں کے تقاضے سے شعر کہتا ہے اور نہ صناعی کے شوق سے۔شعر کہنا تو درکنار جب تک طبیعت میں خاص کیفیت موجود نہ ہو وہ کسی کے تقاضے سے شعر سناتا بھی نہیں۔یہ صاحبِ کمال شخص وقتاً فوقتاً خود اپنے اوپر نظر ڈال کر اپنی کیفیت کس طرح بیان کرتا ہے۔ اقبال کے کلام کا زیادہ تر حصہ حیات و کائنات کے مظاہر و حوادث پر اس کے اپنے نفس کا ردِ عمل ہے۔ اقبال کے نظریات حیات اس کی اپنی نفسی کیفیات کے ساتھ پیوست ہیں۔اقبال ان لوگوں کا جو عقل و فن میں مگن ہیں اور ان لوگوں کا جو دلِ بے قرار رکھتے ہیں میری اور تیری کے الفاظ میں موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم کو اپنے علم اور فن پر ناز ہے اور یہ تمھاری ساری جمع پونجی جبکہ میری زندگانی کا سرمایہ میرا

دلِ بے قرار ہے۔علم اور فن ایک دائرے میں محیط ہیں جبکہ دلِ بے قرار کے سامنے یہ ساری دولت سرمایہ ، عیش و عشرت سب بے معنی چیزیں ہیں۔دلِ بے قرار کے سامنے دنیا ایک رائی کی مانند ہے۔بے قرار دل میرا عشق ہے اور یہ دولت دولتِ علم پر فائق ہے۔"ضربِ کلیم" کی ایک غزل میں اقبال حیات کو بے قرار دل کے ساتھ دنیا کی مال و دولت پر ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور(۷)

متصوفانہ ادب میں ابلیس کے متعلق طرح طرح کے تصورات ملتے ہیں۔کسی نے اس کو ملعون ہونے کی بجائے سب سے بڑا موحد قرار دیا۔جس نے حکمِ الٰہی کے باوجود غیر خدا کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔کسی نے اس کو مادیت کا امام گردانا ہے کہ آدم کا خاکی عنصر تو اس کو نظر آیا اور اس کے عرفان اور روحانی ممکنات اس کو نظر نہ آ سکے۔ابلیس کی ماہیت کا اندازہ خیر و شر سے لگایا جا سکتا ہے۔حیات و کائنات میں خیر و شر کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے۔حکما نے شر کے دو حصے بتائے ہیں۔ایک شر حقیقی اور شر طبعی اس کے برعکس قرآنِ حکیم نے یہ کہا ہے کہ خیر و شر سب خدا کی طرف سے ہے۔انسان کے لیے شر کی ماہیت کا سمجھنا اور ہستی میں اس کا مقام متعین کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ خیر کی ماہیت کو سمجھنا۔اقبال کے ہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفہ خودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔خودی کی ماہیت میں ذات الٰہی سے فراق اور سعی قرب و وصال دونوں داخل ہیں۔اقبال کے ہاں عشق کی ماہیت آرزو، جستجو اور اضطراب ہے۔اگر انسان کے اندر باطنی کشاش نہ ہو تو زندگی جامد ہو کر رہ جائے گی۔اقبال جدوجہد کا مبلغ ہے۔ان کی شاعری کا محور حرکت و عمل پر منحصر ہے۔ابلیس کو اقبال نے اپنی شاعری میں جا بجا استعمال کیا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حرکت کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ابلیس جس کو ناری مخلوق کہا جاتا ہے۔ابلیس کے آتش نژاد ہونے کے یہی معنی ہیں کہ موجودات کا وجود حرارت سے ہے۔ اقبال نے کئی جگہ متفرق اور منتشر اشعار میں اپنے اس نظریے کو بیان کیا ہے کہ زندگی اضطراب مسلسل، جستجوئے پیہم اور منزل کی خواہش سے بیگانہ ذوق سفر ہے۔"ابلیس کی مجلس شوریٰ" معروف نظم جو کہ موجودہ عہد کی پارلیمنٹ کے متبادل قائم کی گئی ہے۔جس میں ابلیس کے پانچ مشیر خاص دور حاضر پر بحث کرتے ہیں اور جبکہ آخر میں شیطان جو ان کا سربراہ ہے وہ فیصلہ کن رائے دیتا ہے اور انسانی حیات کو جامد کردینے کے مشورے سے ہمکنار کرتا ہے۔کہتا ہے کہ مسلمان کے لیے وہ شاعری اور روحانی علم و عمل ہی

زیادہ اچھا ہے جس کی بدولت وہ عملی زندگی سے بیگانہ اور زندگی کے دل چسپ نظاروں سے محروم رہے جبکہ اسلام ایسے فنونِ لطیفہ اور روحانی طور طریقوں سے منع کرتا ہے جس سے زندگی کی اصل حقیقت سے بے گانہ ہو جائے۔ یہاں تصوف سے مراد مطلق تصوف یا اسلامی تصوف نہیں بلکہ ایسا تصوف ہے جو رہبانیت کا ہم پلہ ہے۔ابلیس اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ حیات انسانی کو جامد کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرو:

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات(۸)

علامہ اقبال کی وفات سے دنیائے ادب کو بالعموم اور ہندوستان کو بالخصوص جو صدمہ اٹھانا پڑا وہ محتاج بیان نہیں۔ مغرب کی مادیات کے مقابلہ میں آپ مشرق کے تصوف و روحانیات کے علم بردار تھے۔ حقیقت میں ان کے کلام تمام نوعِ بشر کے لیے ہے لیکن انسانی طبیعت کا خاصا ہے کہ مغلوب قوم یا فرد سے ہمیشہ اسے ایک گونا ہمدردی سی ہو جاتی ہے۔ان دنوں میں مشرق کے باشندے عام طور پر روبہ تنزل ہی رہیں۔ مشرق کے اس سیاسی، روحانی اور اقتصادی انحطاط کو دیکھ کر اقبال نے اپنے کلام میں مشرق اقوام ہی کو مخاطب کیا۔ اقبال کا ایک مستقل موضوع ان کا فلسفہ خودی ہے۔خودی عبارت ہے ، انسان کے روحانی عروج، ذاتی ارتقا اور اس کی خود داری سے۔درحقیقت اقبال کی تمام شاعری اسی ایک محور کے گرد گھومتی ہے اور اسی کو توضیح اور تعبیر ہے۔وہ بار بار اسی کے تار کو چھیڑتے نظر آتے ہیں۔ گویا کوئی دوسرا نغمہ ان کو پسند ہی نہیں۔ ’’ارمغانِ حجاز‘‘ کی نظم ’’مسعود مرحوم‘‘ میں ’حیات‘ کی تشریح الگ انداز میں کرتے ہیں۔ اگر آدمی کے پاس ایسا دل ہے جو عشق سے زندہ ہے اور اس جذبہ کی بنا پر اسے اپنی معرفت یا اپنی پہچان حاصل ہے تو اسے معلوم ہے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں، میری کیا قدر و قیمت ہے، مجھ میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا صفتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں۔ایسی صورت میں موت بھی زندگی کے برابر ہے۔موت کا مرحلہ تو صاحبِ خودی کے عشق کا امتحان ہوتا ہے جس سے اس کے جذبہ کے استحکام اور مضبوطی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا عشق اگر مستحکم ہو گا اور اس کی وجہ سے اس کی خودی بھی اگر مضبوط ہو گی تو پھر یہ امتحان دینے کے لیے تیار رہے گا اور اس سے گزر کر ایک نئی زندگی کی منزل میں داخل ہو جائے گا۔انسان کی خودی میں دلِ بے قرار ہے تو موت بھی اس کو جاوداں زندگی عطا کر دیتی ہے:

خودی ہے زندہ تو ہے موت اِک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات(۹)

اقبال کی شاعری میں لفظ حیات بار ہا ملتا ہے۔ ہر وقت اقبال حیات کو ایک نئے رنگ سے ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی شاعری فلسفہ حیات ہے۔انسان کے اندر جوان خون آرزو اور تمنا لیے گردش کرتا ہے تو جوش حیات اور ولولہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔تمام دنیا اس کے لیے بہشت بن جاتی ہے۔وہ دل کے اندر دیکھتا ہے تو دل کا ہر کونا امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے۔اقبال کا کلام مادہ پرست دنیا کے لیے روحانیت کا پیغام ہے جس سے بار بار اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ عرصہ حیات کی لامتناہی وسعتوں میں ہماری مادی زندگی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ناچیز قطرہ آب کو بحر بے پایاں میں۔لہٰذا انسان کو اتنا تنگ نظر نہیں ہونا چاہیے کہ کنویں کے مینڈک کی طرح اس کی نگاہیں ہر وقت مادہ کی چار دیواری میں ہی محدود رہیں۔

حوالہ جات

۱۔　احمد دہلوی ، سید، فرہنگ آصفیہ،جلد اول، لاہور: مشتاق بک کارنر، ۲۰۱۵ء، ص۸۴۷

۲۔　عبدالمجید ، خواجہ، جامع اللغات،جلد اول، لاہور: اردو سائنس بورڈ،طبع سوم، ۲۰۱۰ء، ص۹۳۱

۳۔　فیروز الدین ، مولوی، مرتبہ: فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، بار اول، ۲۰۱۰ء، ص۵۷۷

۴۔　اقبال،کلیاتِ اقبال(اردو)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت ششم ، ۲۰۰۴ء، ص۱۴۴

۵۔　ایضاً، ص۱۵۱

۶۔　ایضاً، ص۴۲۰

۷۔　ایضاً، ص۶۸۷

۸۔　ایضاً، ص۱۲۷

۹۔　ایضاً، ص۴۲۵۷